برصغیر کی اردو تفاسیر پر تفسیر روح المعانی کے صوفیانہ اثرات

The mystical influences of Tafsir Rooh al-Ma'ani on Urdu Tafsir of the Subcontinent

MURAD ALI
PhD Scholar, Imperial College Of Business Studies, Lahore
muradalidanish@yahoo.com
Dr. MUHAMMAD IMTIAZ HUSSAIN
Asst. Pro. Imperial College Of Business Studies, Lahore

ABSTRACT

The Holy Quran is Allah Almighty's final message for mankind. It is a complete guideline in every age till the day of judgement. The Allah Almighty bestowed this Ummah with capable exaggerators of Quran who have tried to make this book understandable for common Muslims. Some of those exaggerators' work is commendable that lasted its great impact on others. Such great name is Sayyad Mahmood Aalusi who wrote 'Tafseer Rooh ul Muaani' during the period of 1252hj – 1267hj. This exaggeration is very comprehensive interpretation of Holy Quran in 30 volumes. It provides detailed notes on problems based on surf, nahv, Faith, Fiqh and Sufism discussed in Holy Quran. It influenced exaggerators came after him so the Urdu exaggerations of subcontinent too. In this article it is showed that Urdu exaggerations in subcontinent were influenced by Tafseer Roh ul Muaani. I have focused on interpretations related to Sufism. I have given many examples in this regard.

Keywords: The Holy Quran, Sayyad Mahmood Aaloosi, Tafsir Rohulmuaani.

تعارف:

فہم قرآن نزول قرآن سے ہی علماء وصلحاء کی توجہ کا محور رہا ہے۔ قرآن فہمی کی انہی کاوشوں میں سے ایک ''تفسیر القرآن'' ہے۔ نامور علماء نے قرآن فہمی کے لئے تفسیر نگاری کا راستہ اپنایا۔ انہیں تفاسیر قرآن میں سے ایک تفسیر روح المعانی ہے۔ تفسیر ''روح المعانی'' علامہ سید محمود آلوسی (متوفی 1270ھ) کی ایک اہم تفسیر ہے جو اہل علم کے لیے ہمیشہ سے نہایت اہم رہی ہے۔ یہ تفسیر بہت جامع ہے جو بہت سے علوم وفنون کا شاندار امتزاج ہے۔ اس میں اعتقادی، فقہی، صرفی، نحوی اور صوفیانہ ابحاث قابل ذکر ہیں۔ علامہ آلوسی نے قرآن کی تعلیمات کے پہلوئے تصوف کو بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے جس کا اندازہ قاری کو آپکی تفسیر کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ یہی وہ ابحاث ہیں جن سے اردو مفسرین کرام نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ زیرِ نظر آرٹیکل میں اردو تفاسیر پر تفسیر روح المعانی کے صوفیانہ اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

آداب دعا:

دعاعبادت کا مغز ہے، قرآن مجید میں بارہااس کاذکر کیا گیاہے اور اسکی ترغیب دی گئی ہے، انبیاء کرام نے اپنی سنت سے دعا کے آداب سکھائے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾ (1)

حضرت زکریاؑ کی عمر بعض روایات کے مطابق ستر سال اور بعض کے مطابق ایک سو بیس سال اور آپ کی اہلیہ محترمہ کی عمر اٹھانوے سال ہوگئی تھی اور ابھی تک ان کے ہاں کوئی فرزند تولید نہ ہوا تھا۔ ایک روز دل کا سوز التجا بن کر زبان پر آ ہی گیا۔ عجز و نیاز میں ڈوبے ہوئے انداز ے بارگاہ رب العزت میں غم پنہاں کا اظہار کر دیا۔ بڑی خاموشی سے چپکے چپکے اپنے چارہ ساز کے حضور میں اپنی حکایت درد کہہ دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے پاک نبی کے طلب اور انداز طلب دونوں غور طلب ہیں۔ علامہ آلوسیؒ اس آیت کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''حضرت زکریاؑ نے چھپ کر دعا اس وجہ سے کی تاکہ یہ اخلاص کے قریب تر اور ریاکاری سے بعید تر ہو۔ اور لوگوں کی اس تنگ نظری سے بھی بچنا چاہتے تھے کہ وہ کہیں گے حضرت زکریاؑ ایسی چیز کا سوال کر رہے ہیں جو ان کو مل ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے''

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ ندا کا معنی دعا ہے اور خفیا کا معنی جو لوگوں سے چھپی ہو اور جس کو کوئی نہ سن سکتا ہو پھر دعا کے بارے میں فرماتے ہیں، ایسی دعا جو رات کے وقت نصف حصہ میں جب اللہ اور بندہ کے ہاں کوئی چیز آڑے نہیں آتی یہ اس سے خالصتاً اللہ کی طرف لو لگانے کی نسبت ظاہر ہوتی ہے اور یہ بلکل پاک و صاف معاملہ ہوتا ہے اس آیت میں حضرت زکریاؑ کے بارے میں بتایا گیا ہے جب انہوں نے اللہ رب العزت سے رات کے نصف حصے میں دعا مانگی تھی۔ اصل میں اسی کو تصوف کہا جاتا ہے کہ اللہ رب العزت اور بندے کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو اور اس کا دل تمام خرافات سے پاک ہو جب انسان اپنے رب کو تنہائی میں یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے کو تنہائی میں یاد کرتا ہے۔

مفتی احمد یار خان نعیمیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ پکارا (2)

---

(1) مریم 3/19

(2) آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین السید محمود، (س ن)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم، لبنان دار الاحیاء التراث، بیروت، ج16، ص120-121

حضرت پیر کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں کہ عجز و نیاز میں ڈوبے ہوئے اندازے بارگاہ رب العزت میں غم پنہاں کا اظہار کر دیا۔ بڑی خاموشی سے چپکے چپکے اپنے چارہ ساز کے حضور میں اپنی حکایت درد کہہ دی۔ پیر صاحب نے نہایت خوبصورت انداز میں مذکورہ آیت سے آداب دعا کا استنباط کیا ہے یہ وہی نقاط ہیں جن کا ذکر علامہ آلوسی اپنی تفسیر میں کرتے ہیں۔

علامہ رسول سعیدی درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ذکر خفی کی فضیلت کا عنوان قائم کرتے ہیں، اس ضمن میں رقمطراز ہیں؛

حضرت زکریا نے آہستگی سے اور چپکے چپکے دعا کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند آواز سے اور چپکے چپکے دعا کرنا دونوں برابر ہیں اور چپکے چپکے دعا کرنا اس لیے اولیٰ ہے کہ اس میں زیادہ اخلاص ہے اور یہ ریا سے دور ہے۔

علامہ امین اصلاحی درج بالا آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی کے مفہوم کو ہی بیان کرتے ہیں

> یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ہے جو انھوں نے فرزند کی ولادت کے لیے کی ہے۔ یہ دعا انھوں نے ہیکل میں، جیسا کہ آگے اشارہ آ رہا ہے، غالباً بحالتِ اعتکاف کی ہے۔ فرمایا کہ اس نے چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کا راز و نیاز کے انداز میں ہونا اس کے اولین آداب میں سے بھی ہے اور اس کی قبولیت کے لیے بہترین سفارش بھی۔ در حقیقت یہی دعائیں ہوتی ہیں جو ریا اور نمائش سے بھی پاک ہوتی ہیں اور انہی کے اندر بندہ اپنے دل کے اصلی راز بھی کھولتا ہے۔ اس وجہ سے دعا کے اس ادب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ صرف اجتماعی دعائیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔[1]

صاحبِ معارف القرآن بھی اس آیت سے وہی معنی اخذ کرتے ہیں جو علامہ آلوسیؒ نے کیا ہے، آپ لکھتے ہیں کہ نِدَاءً خَفِيًّا سے معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ اور خفیہ کرنا افضل ہے۔[2]

مولانا ثناء اللہ امر تسری نے بھی درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ آلوسی کے مفہوم کو لیا ہے کہ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ پکارا۔

---

(1) اصلاحی، مولانا امین احسن، (2002ء)، تفسیر تدبر القرآن، فاران فاونڈیشن، لاہور، ج4، ص635

(2) قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحییٰ، (س ن)، الجامع لاحکام القرآن بیروت، لبنان، دار احیاء التراث العربی، ص143

قربِ الٰہی:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴾[1]

تصوف، تزکیہ نفس اور قلب و باطن کی صفاء و جلا کا نام ہے جس کا خمیر علوم قرآن، سنت نبوی ﷺ اور انبیاءؑ سے اٹھا ہے، مذکورہ آیت میں حضرت موسیٰؑ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

علامہ آلوسی آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہیں:

''آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے کوہ طور پر ملاقات کی تو انہوں نے کوہ طور کا دایاں پہلو منتخب کیا جو کہ تمام انبیاء کی عادت مبارکہ کا حصہ ہے ہر کام کو کرنے سے پہلے اس کا دایاں حصہ انتخاب کرتے ہیں اس سے کمال محبت کا اظہار ہوتا ہے حضرت موسیٰؑ تمام جہتوں سے اور تمام اعضاء سے ہم کلام ہوئے اور جہاں آپؑ سے بات کی گئی وہ مقام عقل سے دور تھا لیکن آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مناجات کے لیے قریب کیا اور موسیٰؑ کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کیا حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جگہ ملاقات کی جہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا''

مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تمام مفسرین نے اسی انداز کو اپنایا ہے۔

مولانا احمد یار خان نعیمیؒ لکھتے ہیں کہ

(اس آیت میں وہ واقعہ بیان فرمایا جارہا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سے رخصت لے کر مدین سے واپس مصر جارہے تھے، اسی سفر میں موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا گیا چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا فرمائی جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب طور پہاڑ تھا اور اپنے قربِ خاص کے راز و اسرار تنہائی میں ان کو عطا فرمائے۔)[2]

---

(1) مریم52/19

(2) نعیمی، احمد یار خان، (1999ء)، تفسیر نعیمی، مکتبہ اسلامیہ اردو بازار، لاہور، ج16، ص282

صاحبِ ضیاءالقرآن بھی آیت میں مذکور واقعہ کا پس منظر بیان کرتے ہیں کہ طور پہاڑ ہے جو مصر اور مدین کے درمیان واقع ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دس سال حضرت شعیب کے پاس مدین میں گزارنے کے بعد جب واپس مصر روانہ ہوئے تو ان کا گزر طور پہاڑ کے قریب سے ہوا تو پہاڑ کا جو حصہ آپ کے دائیں جانب تھا اس سے یہ ندا آئی۔

علامہ غلام رسول سعیدی درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ آلوسی کے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔اس آیت میں ہے ہم نے انھیں قریب کر کے رازدار بنایا۔[1]

صاحب تدبر القرآن درج بالا آیت میں الفاظ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا کے معنی لکھتے ہیں کہ (نجی)راز اور سرگوشی کو بھی کہتے ہیں . اور اس شخص کو بھی کہتے ہیں جس سے سرگوشی کے انداز میں بات کی جائے،اور اس کو محرم راز بنایا جائے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتیازِ خاص کی وضاحت ہے۔ جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے طور کی دائیں جانب سے اس کو پکارا اور راز و نیاز کے لیے اس کو قرب عطا کیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جو کلام کیا اس کو راز و نیاز اور سرگوشی سے تعبیر فرمایا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء سے جب کلام کیا ہے تو ہمیشہ اپنے مقرب و معتمد فرشتے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ہی سے کیا۔ کبھی براہ راست کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوا کہ ان سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر کلام فرمایا۔ کوئی تیسرا درمیان میں حائل نہیں ہوا۔ البتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس موقع پر بھی باوجود اشتیاق کے ،اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل نہ ہو سکا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم ناسوت میں کوئی جن و بشر یہاں تک کہ پہاڑ بھی خدا کی تجلی کی تاب نہیں لا سکتا۔[2]

مفتی محمد شفیع صاحب درج بالا آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں۔ نَجِيًّا، سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اس کو نجی کہا جاتا ہے۔

علامہ امر تسری اس آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں۔اور قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر خیر کر تحقیق وہ بڑا ہی صاف اور خالص بندہ اللہ کا رسول اور نبی تھا بڑا اولوالعزم اور مضبوط ارادے والا کام کر گزرنے

(1) سعیدی، غلام رسول، (2009ء)، تبیان القرآن، فرید بک سٹال لاہور، ج4، ص94

(2) اصلاحی، مولانا امین احسن، (2002ء)، تفسیر تدبر القرآن، فاران فاونڈیشن، لاہور، ج4، ص663

والا ہم نے اسکو کوہ طور کی دائیں جانب سے بلایا اور اس کو مناجات اور دعا کی حالت میں اپنا مقرب بنایا اور محض اپنی رحمت خاص سے ہم نے ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبی بنا کر اس کے ساتھ کر دیا جیسا کہ اس کی درخواست تھی۔[1]

ذکر بالجہر اور ذکر بالسر:

ذکر الٰہی اسلامی تصوف کے دیئے ہوئے نظام تربیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ذکر کی اہمیت اور انداز کو ہر دور میں صوفیاء نے بیان کیا ہے اور ان کے متوسلین اس پر عمل پیرا بھی رہے۔ مگر بد قسمتی سے یہ امر ایک متنازعہ معمول کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ ذکر بلند آواز سے کیا جائے یا آہستگی سے ؟ذکر میں اللہ کو کس طرح پکارا جائے۔درج ذیل آیت کریمہ ذکر سے متعلق انہیں سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے

﴿وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى () اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾[2]

چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے:

(تمام اشیاءاللہ تعالیٰ کے علمی احاطہ میں ہیں کوئی چیز اس علم سے باہر نہیں اگر کوئی بلند آواز سے اس کو پکارے تو تب بھی وہ اس کو جانتا ہے اور کوئی خفیہ یعنی چھپ کر پکارے تو تب وہ اس کو جانتا ہے جس طرح بھی اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے گا اللہ تعالیٰ ہر حال میں اس کو سنے گا۔ یہ بندے اور اللہ کا تعلق ہے کہ بندہ اپنے رب کو کس طرح یاد کرتا ہے ،اسلامی تصوف میں مقصود اللہ کو چاہنا ہے خواہ وہ مخفی ہو یا الاعلان۔اللہ تعالیٰ کو جتنے زیادہ ناموں سے پکارا جائے گا بندے کو اتنا ہی زیادہ لطف و سرور آئے گا اللہ تعالیٰ کے کئی حسین جمیل نام ہیں بندہ جب ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہیں ہوتی۔یعنی اگر آپ باآواز بلند اللہ کو یاد کرتے ہیں اور دعا و مناجات کرتے ہیں، تو جان لیجیے کہ اللہ اس سے بے نیاز ہے، کیونکہ وہ تو چھپے ہوئے رازوں کو جانتا ہے، بلکہ رازہائے سربستہ سے بھی زیادہ مخفی باتوں کو جانتا ہے جنہیں ابن آدم نہیں جانتا ہے جن کا علم صرف علام الغیوب کو ہوتا ہے۔)

مفتی احمد یار خان نعیمیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

---

(1)امر تسری، ثناءاللہ، مولانا،(س ن)، تفسیر ثنائی، مہر کتب خانہ، کراچی، ج2، ص254

(2)طہ،20/7-8

وان تجھربالقول میں فرمایا جارہا ہے کہ اس کو بتانے کے لیے اگر تو قول و فریاد، التجاء دعا بلند کرے تو ایسا نہ کر، وہ عالم ماکان و مایکون تو یعلم السر و اخفی ہے، بغیر بولے کلام کو اور بغیر ارادۂ قلبی والے آئندہ امور و افعال کو بھی جانتا ہے[1]

پیر کرم شاہ الازہریؒ کے مطابق سر سے مراد راز کی وہ بات جو تو نے صرف کسی اپنے خاص دوست سے پردہ میں کہی ہو۔اور اخفیٰ وہ بات ہوتی ہے جو ابھی دل کے پوشیدہ خانے میں ہی کروٹیں لے رہی ہو اور زبان تک نہ آئی ہو۔(قال الحسن السوما اسر الرجل الی غیرہ واخفیٰ من ذلک ما السرفی نفسہ)، وہ سب اس ہستی کے احاطۂ علم میں ہے، جس کی حکمرانی کا یہ حال ہو کہ کائنات کی ہر چیز اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ ہو اور جس کی ہمہ دانی اور ہمہ بینی کی یہ کیفیت ہو کہ حال اور مستقبل سب عیاں ہوں کیا ایسی ہستی کو تسلیم کرنے میں کسی کو شک ہو سکتا ہے اور کوئی دوسرا اس کا ہمسر، خیال کیا جا سکتا ہے؟[2]

علامہ غلام رسول سعیدیؒ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہیں کہ اگر آپ بلند آواز سے بات کریں تو بے شک اللہ تعالیٰ آہستہ اور اس سے بھی زیادہ پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔[3]

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کو خوب معلوم ہے کہ تم پر کیا کیفیت گزر رہی ہے۔ وہ تمہارے دلوں کی پکار تک سن رہا ہے۔[4]

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت سے مراد ہے کہ خواہ تم بات کو علانیہ کہو یا چپکے سے کہو، اللہ تعالیٰ علانیہ، پوشیدہ اور پوشیدہ تر سب کو جانتا ہے۔[5]

مفتی محمد شفیع درج بالا آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰي، سر سے مراد وہ چیز ہے جو انسان نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہے کسی پر ظاہر نہیں اور اخفیٰ سے مراد وہ بات ہے جو ابھی تک تمہارے دل میں بھی نہیں آئی آئندہ کسی وقت دل میں آئے گی حق تعالیٰ ان سب چیزوں سے واقف و باخبر ہیں کہ اس وقت کسی انسان کے دل میں کیا ہے اور کل کو کیا ہو گا۔

---

(1) نعیمی، احمد یار خان، (1999ء)، تفسیر نعیمی، مکتبہ اسلامیہ اردو بازار، لاہور، ج16، ص446

(2) ازہری، محمد کرم شاہ، پیر، (1995ء)، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ج3، ص105

(3) سعیدی، غلام رسول، (1999ء)، تبیان القرآن، ج4، ص122

(4) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ت(1980ء)، فہم القرآن، مکتبہ تعمیر انسانیت، اندرون موچی دروازہ، لاہور، ج3، ص157

(5) اصلاحی، مولانا امین احسن، (2002ء)، تفسیر تدبر القرآن، فاران فاونڈیشن، لاہور، ج5، ص17

مولانا ثناءاللہ امر تسری نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر یوں کی ہے، آسمانوں اور زمینوں میں اور ان کے درمیان اور کرہ خاک بلکہ اس سے بھی نیچے جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اسی نے سب کو پیدا کیا ہے اور وہی سب کار کھوالا ہے یہ تو اس کی قدرت اور حکومت کا بیان ہے۔اس کے علم کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ایک کے دل کی بات جانتا ہے اگر کوئی بلند آواز سے بات کرے یا آہستہ کچھ فرق نہیں کیونکہ وہ آہستہ آہستہ سے بھی پوشیدہ کو جانتا ہے۔

تزکیۂ نفس:

تصوف اس طرز زندگی کا نام ہے جس میں بندہ غیر اللہ سے منہ موڑ کر اپنے معبود و محبوب حقیقی کے ساتھ بے لوث رشتہ قائم کر لیتا ہے نتیجۃً اس تعلق بندگی سے اسے وہ روحانی لذت وانبساط اور لطف و کیف نصیب حاصل ہوتا ہے جسے اقبال کی زبان حقیقت نے اس طرح ادا کیا ہے:

"دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو عجب چیز ہے لذت آشنائی"

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (1)

چنانچہ اسی تصوف کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسیؒ سورۃ الاعلیٰ کی آیت نمبر ۱۴ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے:

(پاکیزگی اختیار کرنے سے مراد قلب و ذہن کی پاکیزگی بھی ہے اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی بھی، قلب و ذہن کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی شرک اور کفر و الحاد کی آلودگی سے اپنے کو پاک کر لے اور خدا و آخرت پر ایمان لے آئے اور اخلاق و عمل کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی برائیوں کو چھوڑ دے اور نیک کام کرے)(2)

پھر لکھتے ہیں:

(1) الاعلیٰ 14/87

(2) آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین السید محمود، (س ن)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم، بیروت، لبنان دار الاحیاء التراث، ج15، ص195

"قد افلح سے مراد وہ ناپسندیدہ باتوں سے نجات پائے گا اور جس چیز کے لیے وہ تمنا کرے گا اس میں اس کو کامیابی حاصل ہو گی، من تزکیٰ سے مراد وہ شرک سے پاک ہو جائے گا"[1]

اس میں دو چیزیں ظاہر ہو گئیں کہ کفر اور معصیت سے وہ شخص پاک ہو جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے لیے غیر اللہ سے ناطہ توڑ لے گا۔ دراصل تصوف میں اپنے دل کو ان چیزوں سے پاک کر دیا جائے تو اسی کا نام تزکیہ نفس ہے جو تصوف میں مقصود و مطلوب ہے۔

مولانا غلام رسول سعیدی درج بالا آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بیشک جس نے اپنا باطن صاف کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔[2]

اب یہ بحث ہے کہ تزکیہ سے کیا مراد ہے؟ کہ تزکیہ سے مراد ہے: کفر و شرک کو ترک کر کے اپنے باطن کو صاف کرنا اور کفر کی تاریکی کو اپنے قلب سے زائل کر کے اس کو ایمان کے نور سے روشن کرنا، کیونکہ اس آیت میں مطلق تزکیہ کا ذکر ہے اور جب کسی چیز کو مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد اس کا کامل فرد ہوتا ہے اور تزکیہ کا کامل فرد کفر اور شرک کو زائل کرنا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: "تزکی" کا معنی ہے: "لاالہ الااللہ" پڑھنا۔[3]

مولانا مودودیؒ درج بالا آیت سے یہ معانی اخذ کرتے ہیں کہ اس آیت میں پاکیزگی سے مراد ہے کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانا، برے اخلاق چھوڑ کر اچھے اخلاق اختیار کرنا، اور برے اعمال چھوڑ کر نیک اعمال کرنا، فلاح سے مراد دنیوی خوشحالی نہیں ہے بلکہ حقیقی کامیابی ہے، خواہ دنیا کی خوشحالی اس کے ساتھ میسر ہو یا نہ ہو۔[4]

مولانا امین احسن اصلاحی کے مطابق اوپر کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت سے گریز اختیار کرنے والوں کا انجام بیان فرمایا۔ اب یہ ان لوگوں کا انعام بیان ہو رہا ہے جن کا ذکر اوپر سیذکر من یخشی کے الفاظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ بیشک ان لوگوں نے فلاح پائی جنہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تذکیر سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو کفر و شرک کی آلودگی سے

(1) ایضاً، ج15، ص195

(2) الاعلیٰ 87/14-19

(3) سعیدی، غلام رسول، (2009ء)، تبیان القرآن، فرید بک سٹال لاہور، ج12، ص698

(4) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، (1980ء)، تفہیم القرآن، مکتبہ تعمیر انسانیت، اندرون موچی دروازہ، لاہور، ج6، ص615

پاک کرلیا۔ان کے لیے دنیا میں بھی فلاح کے دروازے کھلیں گے اور آخرت میں بھی یہ اپنے رب کی رحمت ورضوان سے نوازے جائیں گے۔یہاں لفظ تزکی کا مفہوم عام ہے جس میں ایمانی اور اخلاقی تزکیہ وطہارت بھی داخل ہے اور مال کی زکوۃ دینا بھی ہے۔

اوراد وتسبیحات:

﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾[1]

فرشتے باوجود مقربین بارگاہ ہونے کے ذرا شیخی نہیں بکارتے اور نہ اپنے پروردگار کی بندگی اور غلامی کو فخر سمجھتے ہیں،وظائف عبودیت کے ادا کرنے میں کبھی سستی یا کاہلی کو راہ نہیں دیتے۔شب وروز اس کی تسبیح اور یاد میں لگے رہتے ہیں۔نہ جھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔بلکہ تسبیح وذکر ہی ان کی غذا ہے۔جس طرح ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں اور دوسرے کام بھی کرتے رہتے ہیں،یہی کیفیت ان کی تسبیح وذکر کی سمجھو۔وہ کسی کام پر مامور ہوں،کسی خدمت کو بجالا رہے ہوں ایک منٹ ادھر سے غافل نہیں ہوتے جب معصوم و مقرب فرشتوں کا یہ حال ہے تو خطاکار انسان کو کہیں زیادہ اپنے رب کی طرف جھکنے کی ضرورت ہے۔ایسے ہی صوفیانہ الفاظ علامہ آلوسیؒ بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ آپؒ رقم طراز ہیں:

''کائنات کی ہر چیز اس کے قبضہ میں ہے اور وہ ساری دنیا ومافیہا کا مالک ہے اور فرشتے اس کا حکم بجالاتے ہیں،اور اپنے فرائض منصبی کو بڑی تندہی سے ادا کرتے ہیں،شب وروز اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں،اور کبھی ملال ومکدر کا اظہار نہیں کرتے،اسی طرح کچھ لوگ عبادت وریاضت اور مجاہدہ کے ذریعے ظاہر وباطن کو پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور معرفت خداوندی حاصل کرلیتے ہیں۔یہ حضرات خود کو نفسانی خواہشات سے روکتے ہوئے عالم قدس کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے کمالات کی حدوں تک پہنچ جاتے ہیں،تاآنکہ یہ ناقص و ناکارہ لوگوں کو کامل وکارآمد اور مقبول بنانے کے قابل بن جاتے ہیں اور سالکین ذکر قلبی کے حصول کے لیے لگے رہتے ہیں،تصوف میں سالکین کا خاص مقام ومرتبہ ہے جو آہستہ آہستہ منزل مقصود تک چلتے رہتے ہیں''[2]

---

(1)الانبیاء22/21

(2)آلوسی،ابوالفضل شہاب الدین السید محمود،(س ن)،روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم،ج9،ص21

پیر کرم شاہ صاحب درج بالاآیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کوئی اس کا بیٹا نہیں کوئی اس کا شریک وہمسر نہیں۔ سب اس کی مخلوق ہیں اور اس کے بندے ہیں۔ جتنا کوئی اس کے قریب ہے اتنا ہی وہ اس کی عظمت و کبریائی سے لرزہ براندام ہے اور اظہار عجز میں سر گرداں ہے اور ہر وقت اس کی عبادت اور ذکر میں لگا رہتا ہے۔''من عندہ '' سے اکثر مفسرین نے فرشتے مراد لیے ہیں۔[1]

علامہ غلام رسول سعیدی آیت کی تفسیر کرتے ہیں کہ یہ زمین اور آسمان بلکہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مملوک اور غلام ہے، انسانوں کی بہ نسبت فرشتے بہت طاقتور ہیں اور بہت عظیم مخلوق ہیں وہ ہر وقت اس کی عبادت کرتے رہتے ہیں اور اس کی عبادت سے نہیں تھکتے۔[2]

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالاآیت کی تفسیر میں من عندہ سے مراد خدا کے مقرب ملائکہ ہیں۔ باہمہ قرب وشرف ان کا حال یہ ہے کہ نہ وہ اس کی عبادت سے کبھی سرتابی کرتے، نہ کبھی اس سے تھکتے ہیں، وہ شب و روز خدا کی تسبیح و تحلیل میں سر گرم رہتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں توقف نہیں کرتے۔[3]

مفتی شفیع اس آیت کی تفسیر میں یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں یعنی ہمارے جو بندے ہمارے پاس ہیں مراد اس سے فرشتے ہیں وہ ہر وقت ہماری عبادت میں بغیر کسی وقفہ کے ہمیشہ مشغول رہتے ہیں يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ، یعنی فرشتے رات دن تسبیح کرتے رہتے ہیں کسی وقت سست بھی نہیں ہوتے۔

مولانا ثناء اللہ امر تسری درج بالاآیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ جو آسمانوں میں فرشتے وغیرہ ہیں اور جو زمین میں حیوانات نباتات اجسام وغیرہ ہے وہ سب کے سب اسے اللہ کی ملک ہے وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو رکھتا ہے، جتنی مدت چاہتا ہے موجود رکھتا ہے جب چاہتا ہے گرادیتا ہے اور جو لوگ اسکے حضور میں ہیں یعنی انبیاء صلحا اور ملائکہ

(1)ازہری، محمد کرم شاہ، پیر، (2005ء)، تفسیر ضیاء القرآن، ج3، ص155

(2)ایضاً، ج4، ص230

(3)اصلاحی، مولانا امین احسن، (س ن)، تفسیر تدبر القرآن، ج5، ص134

غرض جو اللہ کے ہو رہے ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں اور شب و روز اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور کبھی غافل نہیں ہوتے۔[1]

میثاق کا پورا کرنا:

وعدہ پورا کرنا تقوی کے حصول میں معاون ہوتا ہے اور تصوف نام ہی سراسر تقوٰی ہے

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [2]

بنی اسرائیل کو جب تورات دی گئی تو اس وقت ان کے دلوں میں اللہ اور اس کی کتاب کی ہیبت ڈالنے اور خشیت پیدا کرنے کے لیے معجزانہ طور پر ایک ایسی کیفیت پیدا کی گئی کہ ان کے اوپر کوہ طور اٹھا کر معلق کر دیا گیا اس وقت ان سے کہا گیا: ''خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّة '' ''اس کتاب تورات کو اور اس میں بیان کردہ احکام شریعت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو''(وَّاذْكُرُوْا مَا فيه) (لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ)تاکہ تم تقوٰی حاصل کر لو۔

علامہ آلوسیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تورات میں ایسے احکام نہیں تھے جس پر عمل کرنا ناممکن تھا بلکہ وہ اپنی سستی اور غفلت کے پردے میں رہنا پسند کرتے تھے۔اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے موسیٰ کی قوم کے لیے تقویٰ و پاکیزگی چاہی جس سے انسانوں کا باطن پاک وصاف ہوتا ہے۔[3]

مفتی احمد یار خان نعیمی درج بالا آیت کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالٰی اس آیت میں بنی اسرائیل سے مخاطب ہے کہ اے اسرائیلیو ! ہم نے تم پر یہاں تک مہربانی فرمائی کہ جیسے احمق بیمار کو مہربان طبیب زبردستی دوا پلاتا ہے اسی طرح ہم نے تمہارے ساتھ کیا تم بخوشی اصلاح قبول نہ کرتے تھے ہم نے تم پر کوہ طور اٹھا کر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور فرمادیا کہ توریت قبول کرو ورنہ پہاڑ گرتا ہے تم بھی ایسے ضدی واقع ہوئے کہ اس وقت تو جبراً قہراً مان لیا مگر بعد میں اس کو بھی توڑ دیا اور طرح

---

(1)امرتسری، ثناءاللہ، مولانا،(س ن)، تفسیر ثنائی،۲/۲۸۷

(2)البقرہ۲/۶۳

(3)آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین السید محمود، (س ن)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم،۱۱/۱۸۱

طرح کی بدکاری اور بت پرستی میں مشغول ہو گئے توریت شریف کو بدل ڈالا۔ ہم نے اپنے فضل و کرم سے کبھی کبھی تم میں انبیاء بھیجے تاکہ تمہیں ہلاکت اور بربادی سے بچائیں مگر تم نے انہیں بھی ظلماً قتل کر ڈالا پھر بھی ہم نے درگزر کی اگر ہمارا اتنا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم کبھی کے نیست و نابود ہو چکے تھے۔[1]

پیر کرم شاہ الازہری نے اس آیت کا صرف ترجمہ کیا ہے تفسیر نہیں لکھی اور یاد کریں جب ہم نے لیا تم سے پختہ عہد اور بلند کیا تم پر طور کو (اور حکم دیا) اور پکڑ لو جو ہم نے دیا تم کو مضبوطی سے اور یاد رکھو وہ احکام جو اس میں درج ہیں شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔[2]

علامہ غلام رسول سعیدی آیت کی تفسیر سے پہلے عہد اور میثاق کے معنی و مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں عہد کا معنی ہے کسی شے کی حفاظت کرنا اور ہر حال میں اس کی رعایت کرنا، جس عقد کی رعایت لازم ہو اس کو بھی عہد کہتے ہیں۔ ہماری عقلوں میں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار ہے اس کو بھی عہد کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں کتاب اور سنت کے ذریعے احکام دیے ہیں اور ہم نے ان کی اطاعت کا اقرار کیا ہے اس کو بھی عہد کہتے ہیں اور جس چیز کو شریعت نے لازم نہیں کیا تھا لیکن ہم نے از خود نذر مان کر اس کو لازم کر لیا اس کو بھی عہد کہتے ہیں جو کفار مسلمانوں کے عہد میں داخل ہوں ان کو ذو عہد اور معاہد کہتے ہیں۔ عاقدین کے درمیان جس عقد کو حفاظت کے لیے لکھا جاتا ہے اس کو عہد اور وثیقہ کہتے ہیں۔[3]

وثاقت کے معنی ہیں: کسی چیز کو مضبوط کرنا "رسی سے باندھنا" میثاق اس عقد کو کہتے ہیں جس کو قسم اور اقرار کے ذریعہ موکد کیا گیا ہو۔[4][5]

مولانا مودودیؒ اس آیت کی بڑی مختصر سی تفسیر کرتے ہیں کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتحال پیدا کر دی گئی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ ان پر آپڑے گا۔[6]

---

(1) نعیمی، احمد یار خان، تفسیر نعیمی، ج1، ص412

(2) ازہری، محمد کرم شاہ، پیر، تفسیر ضیاء القرآن، ج1، ص63

(3) اصفہانی، امام راغب، (س ن)، المفردات القرآن فی غرائب القرآن، مطبوعہ المکتبہ المرتضویہ، ایران، ص350

(4) ایضاً، ص511-512

(5) سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، ج1، ص438

(6)، مودودی، سید ابوالاعلی، (1980ء) تفہیم القرآن، ج1، ص83

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر سے پہلے لفظ میثاق کے معنی و مفہوم پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں کہ موثق اور میثاق کے معنی عہد وپیمان کے ہیں۔اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے اس وجہ سے خاص طور پر اس عہد وپیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار واقرار کیا گیا ہو۔یہاں سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔شریعت الٰہی خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مفتی شفیع صاحب بھی دیگر مفسرین کرام کی طرح اس آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی کا موٴقف لیتے ہیں۔

صاحبِ تفسیر ثنائی لکھتے ہیں کہ درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے مخاطب ہے کہ سنو جب ہم نے تم پر پہاڑ کو اونچا کر کے تم سے وعدہ لیا کہ توریت پر عمل کرو اور حضرت موسیٰؑ کو زبانی تاکید بھی کی جو تم کو ہم نے دیا اسے مضبوط پکڑے رہنا اور جو اس میں ہے اسے دل سے یاد کرنا اور اس امر کی امید رکھنا کہ شاید تم عذاب سے چھوٹ جاو مگر تم ایسے کہاں تھے کہ سیدھے رہتے پھر بھی اپنے عہد وپیمان سے تم پھر گئے جس کے سبب عذاب کے حق دار ٹھہرے اگر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بے شک تم جان پاتے کہ دین و دنیا میں تم کو سخت ذلت پہنچی۔

خشوع وخضوع:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (1)

علامہ آلوسی تَبَتَّلْ کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ

(ہر طرف سے تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جا اور اپنے نفس کو ہر کسی کے خیال سے پاک کرے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کے مراقبہ میں مستغرق ہو جا)(2)

تصوف کا مقصد انسان کو اس قدر روحانی بلندی عطا کر دینا ہے کہ وہ محبوب حقیقی میں فنا ہو جائے چنانچہ علامہ آلوسیؒ کی تفسیر ایسے ہی صوفیانہ نظریات وخیالات سے بھری پڑی ہے اگر اس تفسیر کو صوفیانہ تفسیر کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا آپ نے جگہ جگہ آیات کی تفسیر صوفیانہ کی ہے،اس آیت کی تفسیر میں بھی آپ نے حضور ﷺ کی ریاضت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

(1)المزمل 8/73

(2)آلوسی،ابوالفضل شہاب الدین السید محمود،روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم،ج15،ص183

نے اپنے محبوب کو حکم دیا کہ: ''اے نبی اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور تمام مخلوق سے کٹ کر اس کی طرف متوجہ ہو جا''اس کا مطلب ہے تمام مخلوق سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا کہا گیا ہے تاکہ اس غفور الرحیم ذات سے ہمارا رشتہ قائم ہو جائے پھر فرمایا خواہ دن ہو یا رات ہر وقت تسبیح و تحلیل اور صلوۃ و قراءت میں اپنا وقت گزارتا کہ اس سے روحانی طور پر ہم جڑ جائیں اور کوئی لمحہ ہم اس کی ذات سے غافل نہ ہوں۔

پیر کرم شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی کے مفہوم کو بیان کیا ہے۔ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مامور بہ ذکر و عبادت ہے۔اس آیت میں ذکر اللہ کے حکم کو لفظ اسم کے ساتھ مقید کر کے واذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ فرمایا ہے واذکر ربك نہیں فرمایا اس میں اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسم رب یعنی اللہ اللہ کا تکرار بھی مطلوب و مامور بہ ہے[1]

علامہ غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دو چیزوں کا حکم دیا ہے، ایک اس کے نام کا ذکر کرنے اور دوسرا سب سے منقطع ہو کر صرف اس کی طرف متوجہ رہنے کا۔

یہاں دو چیزیں ہیں: ایک رب کے نام کا ذکر کرنا، دوسرا ہے دل میں رب کا ذکر کرنا، یہاں فرمایا ہے: آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿ وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً﴾[2]

(آپ چپکے چپکے اور گڑگڑا کر اپنے دل رب کا ذکر کیجئے۔)

مفتی شفیع صاحبؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ آلوسی کے بیان کردہ مفہوم کو لیا ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا تبتل کے لفظی معنی مخلوق سے منقطع ہو کر خالق کی عبادت میں لگ جانے کے ہیں۔تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا یعنی آپ تمام مخلوقات سے قطع نظر کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی عبادت میں لگ جائیں اس کے مفہوم میں اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک نہ کرنا بلکہ اللہ کے لیے عبادت کرنا بھی شامل ہے اور یہ بھی کہ اپنے تمام اعمال و افعال اور حرکات و سکنات میں نظر اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر رہے کسی مخلوق کو نفع و ضرر کا مالک یا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھیں۔

---

(1) پانی پتی، قاضی ثناءاللہ پانی پتی، (س ن) تفسیر مظہری، مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ، ص321

(2) الاعراف 205/7

مولانا ثناءاللہ امر تسری درج بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں اور اپنے رب کا نام جپا کر کہ بڑی بات ہے یہ، سب سے کٹ کر اسی سے جڑ جا، تیرے منہ پر یہی جاری ہو۔

خلاصہ کلام:

علامہ شہاب الدین محمود آلوسی جنہوں نے قرآن مجید کی جامع اور مفصل تفسیر کی ہے، آپ کے بعد آنے والے علماء و مفسرین کرام آپ کی تفسیر کو مطالعہ قرآن کے حوالے سے بہت مستند گردانتے ہیں۔ علامہ آلوسی خود ایک روحانی سلسلہ سے وابستہ تھے۔ مصنفین و مفسرین کی ایک بڑی تعداد تفسیر روح المعانی کو صوفیانہ تفسیر بھی کہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب عظیم میں آپؒ نے اکثر آیات مبارکہ کی صوفیانہ تفسیر کی ہے جس سے تصوف کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ منتخب اردو تفاسیر کے جائزہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کسی نہ کسی صورت ان تفاسیر پر تفسیر روح المعانی کا اثر ضرور ہے۔

اس مضمون میں تفسیر روح المعانی کے اردو تفاسیر پر صوفیانہ اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تصوف سے متعلق مختلف موضوعات کا انتخاب کیا گیا ان پر اولاً علامہ آلوسیؒ کا مؤقف پیش کیا گیا بعد ازاں انہیں پر باقی مفسرین کرام کی رائے کو زیرِ بحث لایا گیا کم و بیش تمام موضوعات پر تمام منتخب اردو مفسرین کی تفسیر میں علامہ آلوسی کے مؤقف کی جھلک نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆